U. L. Patna
اردو لائبریری پٹنہ
۱۹۳۸
Acc No.
9782

خدا کی صفات

از

حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی

سابق استاذ

دار العلوم دیوبند

ناشر

مکتبہ نظامیہ دیوبند

قیمت ۳۰ نئے پیسے
نیشنل پرنٹنگ پریس دیوبند
سنہ ۱۳۸۱ھ سنہ ۱۹۶۲ء

URDU LIBRARY
9782
ACC. No.
Date
14.12.87

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صفاتِ باری عزّ اسمہٗ

قَالَ اللہُ تَعَالیٰ

اَللہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ لَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی

ذاتِ خداوندی باوجود ایک ہونیکے پھر سب کمالات کے ساتھ موصوف ہے۔ ایک شخص کلکٹری اور مجسٹریٹی دونوں کے کام کرتا ہے اس لئے دو نام ہوگئے ورنہ حقیقت میں وہ ایک ہی ذات ہے۔ ایسے ہی ذاتِ خداوندی بھی بسبب جدا جدا کاموں کے خالق، رازق، سمیع وبصیر کہلاتی ہے۔ غرض یہ کہ صفات کا متعدد ہونا اس کی وحدت کے کسی طرح منافی نہیں۔

اور جس طرح ذاتِ خداوندی تمام موجودات کے لئے اصل ہے اسی طرح کمالاتِ خداوندی کمالاتِ مخلوق کے لئے اصل ہیں اور مخلوق میں جو کمال ہے وہ اسی کے کمال کا پرتو اور عکس ہے جیسا کہ مخلوقات کا وجود اسی کے وجود کا پرتو اور عکس ہے۔

آفتاب میں اگر نور نہ ہوتا تو زمین کیسے منور ہوتی۔ آتش میں اگر حرارت نہ ہوتی تو پانی کیسے گرم ہوتا۔ علیٰ ہذا اگر خالق میں کمال نہ ہوتا تو مخلوق میں کہاں سے کمال آجاتا۔

بندوں میں حیات بھی ہے علم وقدرت بھی ہے ارادہ واختیار بھی ہے

سمع و بصر اور کلام بھی ہے۔ اور یہ ساری باتیں بالاتفاق خوبی اور کمال کی سمجھی جاتی ہیں۔ یہ کمالات اگر خالق میں نہ تھے تو مخلوق میں کہاں سے آئے۔ نیز اگر خداوند کریم ان صفاتِ کمال کے ساتھ موصوف نہ ہو تو مخلوق کا خالق۔ سے اور ممکن کا واجب سے افضل ہونا لازم آتا ہے۔ اس لئے کہ مخلوق میں حیات، علم، قدرت، سمع، بصر سب موجود ہے۔ اب اگر خدا ان صفات سے عاری ہو تو یقیناً مخلوق کو خالق سے افضل کہنا پڑے گا۔ کیونکہ زندہ کا مردہ سے اور عالم کا غیر عالم سے اور قادر کا غیر قادر سے افضل ہونا بالکل ظاہر ہے۔

حیات

پس ضروری ہے کہ اس میں صفتِ حیات اس درجہ کامل اور اکمل ہو کہ واہمۂ موت سے بھی پاک ہو اور تمام عالم کی حیات اسی کی حیات کا پرتو اور فیض ہو۔ حیات اس کے لئے ذاتی اور اصلی اور خانہ زاد ہو اور کیوں نہ ہو اسلئے کہ ایسے بدیع عالم کا ایک میت اور جماد سے صادر ہونا عقل محال سمجھتی ہے۔ اور باقی عالم کی حیات اسی کی بخشش اور عطا کا ثمرہ ہو۔

اَللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ	اس کے سوا کوئی خدا نہیں، وہ ہمیشہ زندہ رہنے والا اور سب کا سنبھالنے والا ہے۔
+ + +	
وَھُوَ الَّذِیْۤ اَحْیَاکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ سورۂ حج	اسی ذات نے تم کو حیات عطا کی اور وہی پھر تم کو مارے گا اور پھر حیات عطا کریگا۔

Govt. Urdu Library
9782

علم

اور وہ ذات علیم بھی ہے یعنی اس کو ہر ہر ذرہ کی خبر ہے، کوئی شئے ایسی نہیں کہ جو اس کو معلوم نہ ہو۔ کما قال اللہ تعالیٰ۔

اِنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ۔ اللہ تعالیٰ ہر شے کا جاننے والا ہے۔

عالم میں جو کچھ ہوا یا ہو رہا ہے یا ہوگا ازل ہی میں ان سب باتوں کا اس کو بالتفصیل علم تھا ؎

بر و علم یک ذرہ پوشیدہ نیست
کہ پیدا و پنہاں بنزدش یکیست

اور کیوں نہ عالم ہو جب اسی نے تمام عالم کو پیدا کیا اور وہی اسکو باقی رکھتا ہی اور وہی اسکی تربیت کرتا ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ ان چیزوں کا جاننے والا نہ ہو۔ کسی شئے کو موجود کر دینا یا اس کو باقی رکھنا یا اس کی تربیت کرتے رہنا بدون علم کے محال ہے۔

قَالَ تَعَالیٰ اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ۔ کیا وہ نہیں جانتا کہ جس نے پیدا کیا حالانکہ وہی ایک ایسی ذات ہے کہ جو باریک بین اور خبردار ہے

علاوہ ازیں علم کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ معلومات عالم کے سامنے موجود ہوں، کوئی شئے اس سے مخفی نہ ہو اور جہل کی حقیقت یہ ہے کہ معلومات اسکے سامنے موجود نہ ہوں بلکہ غائب اور مخفی ہوں، اور یہ ظاہر ہے کہ مصنوع صانع سے غائب نہیں ہو سکتا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ جن حقائق کو وہ وجود عطا کرتا ہو وہ حقیقتیں اس سے محجوب اور مستور رہوں۔

پس یقیناً عالم کی تمام چیزیں اس معطی وجود کے سامنے بے حجاب اور بے نقاب

ہوں گی۔ اور اسی بے حجاب اور بے نقاب ہونے کا نام علم ہے۔ کما قال تعالیٰ۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَخْفٰی عَلَیْہِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ	بے شک اللہ پر کوئی چیز زمین اور آسمان کی پوشیدہ نہیں۔
وَمَا تَکُوْنُ فِیْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْہُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا کُنَّا عَلَیْکُمْ شُھُوْدًا اِذْ تُفِیْضُوْنَ فِیْہِ وَمَا یَعْزُبُ عَنْ رَّبِّکَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّۃٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ وَلَا اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِکَ وَلَا اَکْبَرَ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ سورۂ یونس	آپ کی کوئی شان اور کوئی تلاوت اور کوئی عمل ایسا نہیں کہ جس پر ہم حاضر اور مطلع نہ ہوتے ہوں جب کہ تم اس عمل میں مشغول ہوتے ہو اور آپ کے رب سے ایک ذرہ بھی پوشیدہ نہیں ہوتا نہ زمین میں اور نہ آسمان میں اور چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی ایسی کوئی شے نہیں کہ جو ہمارے یہاں لوحِ محفوظ میں درج نہ ہو۔

قدرت

اور وہ ذات قدرت بھی رکھتی ہے۔ اس قدرت کی وجہ سے جس شے کو چاہے موجود یا معدوم کر سکتی ہے کسی چیز سے وہ عاجز نہیں جیسا کہ قرآن عزیز میں ہے

اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ	یقیناً حق تعالیٰ ہر شے پر قادر ہیں۔

ایک خدشہ اور اس کا جواب

خدا اگر آپ کے نزدیک قادر مطلق ہے تو اپنے فنا کرنے پر کیوں قادر نہیں؟

جواب یہ ہے کہ فاعل کی تاثیر اور قدرت کو اسوقت ناقص کہہ سکتے ہیں کہ جب مقدورمیں تواثر قبول کرنیکی صلاحیت ہو مگر فاعل کسی وجہ سے اثر نہ کر سکتا ہو۔

شجراور حجر اور دیگر جمادات اگر نور آفتاب سے منور نہ ہوں تو آفتاب کا کیا قصور ہے؟ آفتاب کی تنویر تو شیشہ اور توے دونوں ہی پر واقع ہوتی ہے لیکن آئینہ پر جب اسکی تنویر واقع ہوتی ہے تو جگمگانے لگتا ہے۔ شعاعیں بھی اس میں سے نکلنے لگتی ہیں اور توے میں یہ بات نہیں کیونکہ اس میں روشن ہونے کی صلاحیت ہی نہیں ٹھیک اسی طرح جب اس کی قدرت کاملہ ممکنات کے متعلق ہوتی ہے تو ممکنات اپنی ذاتی استعداد اور صلاحیت کی وجہ سے اس کا اثر قبول کرتی ہیں اور محالات اور ممتنعات اس وجہ سے کہ ان میں اثر قبول کرنے کی صلاحیت اور استعداد ہی نہیں اگر وہ تحت القدرت نہ داخل ہوں تو قدرتِ خداوندی کا کیا قصور ہوا؟ اور باری تعالی پر چونکہ موت اور فنا کا طاری ہونا اس کے حی وقیوم ہونے کی وجہ سے محال ہے اس لئے اگر اس کی موت ظہور میں نہ آسکے تو اس کی قدرت کاملہ کا کوئی قصور نہیں۔

دوسرا جواب

نیز محل تاثیر کا مؤثر سے منفصل اور جدا ہونا ضروری ہے ایک شے خود اپنے اندر کوئی تاثیر نہیں کر سکتی۔ کیونکہ ایک ہی شے کا قابل اور فاعل ہونا عقلاً محال ہے۔ آفتاب دوسروں کو منور کرتا ہے اس کی شعاعیں زمین کے ہر ہر گوشے کو روشن کر دیتی ہیں مگر وہ شعاعیں آفتاب کو روشن نہیں کرتیں۔

تیسرا جواب

علاوہ ازیں اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ آفتاب کی شعاعیں اور اس کے انوار خود آفتاب میں مؤثر ہو سکتے ہیں تو کیا یہ انوار آفتاب کے تاریک اور مُظلم بنانیکے لئے مؤثر ہو سکتے ہیں ؟ ہرگز نہیں۔ اسی طرح خدا کی قدرت کاملہ خدا کو مردہ اور معیوب بنانے کے لئے کارآمد نہیں ہو سکتی۔

چوتھا جواب

یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا وجود واجب اور ضروری ہے اور عدم اس کا محال اور ممتنع ہے اور قدرت کا تعلق محالات کے ساتھ نہ ایجاداً (یعنی قدرت اس محال کو موجود کر دے) ہو سکتا ہے اور نہ اعداماً (یعنی قدرت اس محال کو معدوم کر دے) اس لئے کہ محال اس کو کہتے ہیں کہ جس کا عدم حتمی اور لازمی ہو اور اس کا وجود میں آنا ناممکن ہو۔ پس اگر قدرت کا محال کے ساتھ اعداماً تعلق ہو تو معدوم کا معدوم کرنا لازم آتا ہے جس سے کوئی فائدہ نہیں۔ اور اگر ایجاداً اُس کے متعلق ہو تو محال کا موجود ہونا لازم آتا ہے۔ اور کوئی شے وجود میں داخل ہونے کے بعد محال نہیں رہ سکتی اور علیٰ ہذا قدرت کا تعلق واجبات کے ساتھ بھی نہ ایجاداً ہو سکتا ہے نہ اعداماً ایجاداً تو اس وجہ سے نہیں ہو سکتا کہ موجود کو موجود کرنا سراسر تحصیل حاصل ہے۔ اور اعداماً اس وجہ سے نہیں ہو سکتا کہ واجب یعنی جس کا وجود ضروری اور حتمی تھا اس کا معدوم کرنا لازم آتا ہے۔ اور معدوم ہونیکے بعد وہ شے واجب نہیں رہ سکتی۔

الحاصل اس کے قدیر اور مقتدر ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اور اگر شک ہو تو کیونکر ہو۔ ایسے حکیمانہ افعال اور مناظر قدرت کو دیکھ کر بھی اگر کوئی بدبخت اس کی قدرت کو نہ مانے تو اس کی مثال اس شخص کی سی ہوگی جو مخمل اور کمخواب کو کہ جو قسم قسم کے نقش و نگار سے مزین ہوتا دیکھ کر یہ کہے کہ یہ کپڑا کسی مردہ شخص یا اپاہج اور بے دست و پا انسان کا بُنا ہوا ہے۔

تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ — نہایت بابرکت ہے وہ ذات کہ جس کے قبضہ میں حکومت اور سلطنت ہے اور وہ ہر شے پر قادر ہے۔

ارادہ

ارادہ کے معنی کسی شے کے وجود اور عدم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو کہ قدرت کے اعتبار سے برابر تھے ان میں سے کسی ایک جانب کو اپنے اختیار سے ترجیح دینے کے ہیں۔

پس جو کچھ ہوتا ہے وہ اسی کے ارادہ سے ہوتا ہے۔ ازل میں جو کچھ ارادہ کر لیا تھا، اب اسی کے مطابق ہو رہا ہے۔

قَالَ تَعَالَىٰ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ — جو ارادہ کرتا ہے وہی کر گذرتا ہے۔

عالم میں اس قسم کا انضباط اور استحکام بدون ارادہ اور اختیار کے پیدا ہونا یقیناً محال ہے۔ خدا کے افعال اگر بدون ارادہ اور اختیار خود بخود مثل حرکت مرتعش کے صادر ہوتے تو عالم میں یہ انضباط اور استحکام اور حسنِ انتظام ہرگز ہرگز نہ ہوتا۔

ثبوت تقدیر

جو کام ارادہ اور اختیار سے کیا جاتا ہے پہلے اس کو سمجھ لیتے ہیں۔ مکان اگر بناتے ہیں تو پہلے اس کا نقشہ تیار کر لیتے ہیں تا کہ مکان کی تعمیر نقشہ کے مطابق ظہور میں آئے اس لئے ضروری ہے کہ اس عالم کا نقشہ بھی خدا کے یہاں پہلے ہی سے ایک پنہاں وجود رکھتا ہو اور اس نقشہ ہی کے مطابق اس وجود ظاہری کا کارخانہ برقرار ہوتا ہو۔ اسی وجود پنہانی کو اہل اسلام تقدیر کہتے ہیں۔ ؎

وَنُؤْمِنُ اَنَّ الْخَیْرَ وَالشَّرَّ کُلَّہٗ مِنَ اللّٰہِ تَقْدِیْرًا عَلَی الْعَبْدِ عَدَّدَا
فَمَا شَاءَ رَبُّ الْعَرْشِ کَانَ کَمَا یَشَا وَمَا لَمْ یَشَأْ لَا کَانَ فِی الْخَلْقِ مُوْجِدَا

یعنی ہم اس پر ایمان لاتے ہیں کہ خیر و شر سب اسی کی طرف سے مقدر ہے اور جو کچھ ہوتا ہے وہ اسی کی مشیت سے ہوتا ہے۔

اس مقام پر دو شبہہ ہیں پہلا شبہہ یہ ہے کہ شر اور برائی کا اسکی مشیت سے واقع ہونا اس کی شان تقدس کے خلاف ہے۔ دوسرا شبہہ یہ ہے کہ جب خدا ہی بندہ کے افعال کا خالق ٹھیرا تو برے اعمال میں بندہ کی کیا تقصیر ہوئی۔ ایسی صورت میں بندہ کو سزا دینا کیا ظلم نہ ہوگا۔

معتزلہ

نے اس کی شان تنزیہ اور تقدیس کو قائم رکھنے کے لئے اور ظلم سے بچانے کے لئے یہ کہدیا کہ بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے۔ اور خدا بندہ کے افعال کا

خالق نہیں۔ اور جب بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہوگیا تو خدا کی تنزیہ اور تقدیس میں کوئی فرق نہ آیا۔ اور برے افعال کرنے سے بندہ ہی قصوروار رہتا ہے۔ خدا ظالم نہیں ٹھیرتا۔ لیکن اس کہنے سے کہ بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے اشکال نہیں رفع ہوتا۔ اس لئے کہ اگر افعال بالفرض بندہ ہی کے مخلوق ہوں تو وہ اخلاق اور ملکات اور وہ قدرت و اختیار کہ جس کے ذریعہ سے بندہ افعال کرتا ہے وہ بندے کے مخلوق نہیں۔ اخلاق کو اخلاق اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ خلقی ہیں اخلاق جیسے خدا نے بنا دیئے ویسے ہی بن گئے۔ ان کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ اور ان ہی اخلاق پر جزا و سزا کا مدار ہے۔ جیسا تخم ہوتا ہے ویسا ہی پھل درخت کو لگتا ہے۔

اور جب جزاء و سزاء کا مدار تخم اخلاق پر ہوا اور اخلاق خدا کے مخلوق ٹھیرے تو افعال کو اپنا مخلوق بتلانے سے کیا فائدہ ہوا۔ اور قطع نظر اس کے کہ اس مقام پر کوئی فائدہ ہوا یا نہیں۔ بندہ کو خالق افعال ماننے سے اور چند اشکال سر پڑ گئے۔

پہلا اشکال

یہ ہے کہ بندہ کی مخلوقات خدا کی مخلوقات سے بڑھ جائیں۔ کیونکہ بندہ جو خدا کا مخلوق ہے وہ تو ایک ہے اور بندہ کے ایک ہی دن کے افعال اگر دیکھے جائیں تو لاکھوں تک پہونچ جاتے ہیں۔ اور اگر تمام عمر کے افعال کو دیکھا جائے تو ان کی کوئی شمار ہی نہیں۔ پس اگر ایک ارب انسان خدا کے پیدا کئے ہوئے ہیں تو ہر انسان کے افعال بھی ایک ارب سے کم نہ ہوں گے۔ اس صورت میں خدا کی مخلوقات اگر ایک ارب انسان ہوں گے تو بندوں کی مخلوقات کی میزان کروڑوں

اربٍ ہوگی۔

بندہ اگر اپنی عاجزی اور لاچاری اور خدا کی عظمت اور شوکت کا ذرا بھی خیال کرے تو ہرگز اپنے کو خالق نہ بتلائے۔ جو شخص دو اور چار اور دو دُونی کا مطلب خوب سمجھ لیگا وہ ہرگز یہ نہیں کہہ سکتا کہ دو دُونی پانچ ہوتے ہیں۔ اسی طرح جو خدا کی عظمت اور قدرت اور بندہ کے عجز و نیاز کو خوب سمجھ لیگا اس سے یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ خدا کو عظیم و قدیر نہ مانے اور اپنے آپ کو خالق بتلائے۔

دوسرا اشکال

یہ ہے کہ افعالِ اختیاریہ گو انسان کے اختیار میں ہیں، مگر یہ اختیار تو اسکے اختیار میں نہیں۔ یہ اختیار تو آپ کے نزدیک بھی اسی کا مخلوق ہے۔ علاوہ ازیں جس جس چیز کی بندہ کو اپنے افعال میں حاجت ہے وہ سب اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں ہاتھ اور پیر، آنکھ اور زبان وغیرہ وغیرہ حتی کہ یہ بندہ خود اسی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اس پر بھی اگر بندہ اپنے آپ کو خالق کہے تو بعینہ ایسی مثال ہے کہ دو شخص ایک کھیت کی پیداوار پر تکرار کریں۔ اور ایک شخص ان میں سے یہ اقرار کرے کہ یہ کھیت بھی تیرا ہی ہے۔ بیج بھی تو نے ڈالا۔ جوتنے کے لئے بیل بھی تیرے ہی تھے۔ جو کچھ اس پر صرف ہوا وہ بھی تیرا ہی تھا۔ بایں ہمہ پیداوار میری ہے۔ سو ایسے ظالم کا جواب بجز سزا کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ ہر شخص یہی کہے گا کہ یہ بالکل غلط کہتا ہے۔

تیسرا اشکال

یہ ہے کہ اگر افعال کفر کا خالق ہونا شان تنزیہ اور تقدیس کے منافی ہے

تو معدن کفر اور منبع ضلالت یعنی شیاطین کا خالق ہونا بدرجہا ادنی شانِ تقدیس کے بہت زائد منافی ہوگا۔ فما ھو جوابکم فھو جوابنا۔

ہاں اگر شیاطین کے مخلوق خدا ہونے سے آپ انکار کردیں تو ممکن ہے کہ آپ اس اشکال سے رہا ہوسکیں۔ لیکن یہ ضرور بتانا ہوگا کہ شیاطین پھر کس کے مخلوق ہیں اور کون ان کا خالق ہے۔

چوتھا اشکال

یہ ہے کہ اگر آپ کے نزدیک خلق کفر کی نسبت خدا کی طرف اس کی شان کے منافی ہے تو خلق ایمان اور خلق ہدایت کی نسبت تو منافی نہیں۔ اگر خلقِ کفر شر ہے تو خلق ایمان لامحالہ خیر ہوگا۔ لہذا آپ کو مناسب تھا کہ بندہ کو فقط کفر و معصیت کا خالق مانتے اور ایمان وہدایت کا خالق خدا کو قرار دیتے۔ کیونکہ بندہ کو فقط اس ضرورت سے خالق بتلایا گیا تھا کہ اس کی شان اقدس کی طرف کسی شر کی نسبت لازم نہ آئے۔ اور یہ ضرورت بندہ کو فقط خالق کفر اور خالق معصیت ماننے سے مرتفع ہوسکتی ہے۔ علاوہ ازیں ایک فائدہ یہ ہوگا کہ بندہ کو فقط خالقِ کفر ماننے سے نسبت خلق الی العبد میں تقلیل ہوجائے گی۔ اور خدا کو خالقِ ایمان ماننے سے خدا کی جانب میں ایک خیر کا اضافہ ہوجائے گا۔

پانچواں اشکال

یہ۔ ہے کہ اگر بندہ کو خود اپنے افعال کا خالق کہا جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ یہ

افعال بندہ کی ملک ہیں۔ خدا کی ملک سے خارج ہیں۔ کیونکہ خدا جب ان افعال کا خالق ہی نہیں تو مالک کیسے ہوگا۔ اس صورت میں جزا و سزا کی حقیقت صرف مزدوری اور اجرت رہ جاتی ہے۔ اور بندہ اور خدا کی حیثیت نوکر اور آقا کی سی رہجاتی ہے۔ جیسے نوکر کی نوکری خدمت کرنے سے آقا کے ذمہ لازم ہوجاتی ہے اسی طرح خدا کی اطاعت کرنے سے خدا کے ذمہ اس کی جزا واجب ہو جاتی ہے۔

چھٹا اشکال

یہ ہے کہ جب خدا اور بندہ کی حیثیت نوکر سی ہوئی تو بندہ کا خدا کے برابر ہونا لازم آئے گا۔ اس لئے کہ نوکر نوکری سے پہلے تو آقا کے برابر ہوتا ہی ہے مگر نوکری کے بعد بھی برابر ہی رہتا ہے کیونکہ جب آقا کی خدمت اور تعظیم مول کی ہے تو اس صورت میں بے شک وہ تعظیم اور نوکری دونوں برابر ہوں گی۔ کیونکہ مول کی چیز مول ہی کے برابر ہوتی ہے۔

ساتواں اشکال

یہ ہے کہ جیسا نوکر روپیہ کا محتاج ہوتا ہے اور اسی کی طرح میں خدمت کرتا ہے ایسا ہی آقا بھی نوکر کی خدمت کا محتاج ہوتا ہے اور اسی وجہ سے اپنا عزیز مال صرف کرتا ہے۔ پس اگر خدا اور بندوں میں بھی آقائی اور نوکری کا علاقہ ہو تو بندہ تو محتاج تھا ہی خدا بھی محتاج نکلیگا۔

آٹھواں اشکال

یہ ہے کہ بندوں کا رتبہ خدا سے بھی بڑھ جائے۔ اس لئے کہ ایسے دو شخصوں میں کہ ایک کی اطاعت دوسرے پر لازم ہوں پانچ قسم کے علاقے ہوتے ہیں۔ نوکری۔ غلامی۔ احسان۔ حکومت۔ عشق و محبت۔ پہلی صورت میں دونوں طرف سے مطالبہ ہو سکتا ہے۔ آقا خدمت کا مطالبہ کر سکتا ہے اور نوکر اجرت کا۔ باقی چار صورتوں میں صرف ایک طرف سے مطالبہ ہو سکتا ہے۔ مالک اور محسن اور حاکم اور محبوب کو مطالبہ کا حق حاصل ہے۔ مگر مملوک اور مرہون احسان اور محکوم اور عاشق کو کسی مطالبہ کا حق حاصل نہیں۔

اور ظاہر ہے کہ بندوں میں یہ پانچوں قسم کے علاقے پائے جاتے ہیں۔ پس اگر خدا اور بندوں میں صرف آقائی اور چاکری کا علاقہ ہو تو خدا بندوں سے چار علاقوں کے اعتبار سے کم رہا۔ نیز اگر خدا کو خدمت کے مطالبہ کا حق ہے تو بندوں کو اجرت کے مطالبہ کا حق ہے۔ اور ایک درجہ میں بندہ کا اس پر دباؤ ہے۔

سبحٰن ربّک رب العزۃ عما یصفون۔

خلاصہ

یہ کہ جس ضرورت سے خلق افعال کے قائل ہوئے وہ ضرورت تو رفع نہ ہوئی اور الٹی بہت سی خرابیاں سر پڑ گئیں۔ اس لئے اب اہل حق متوجہ ہوئے کہ کسی طرح ان دو شبہوں کا قلع قمع کیا جائے اور کوئی تشفی بخش جواب دیا جائے۔

مسئلہ تقدیر کے متعلق اہل حق کی تحقیق

گذشتہ صفحات میں ہم یہ بات ثابت کر چکے ہیں کہ خلق قبیح قبیح نہیں اور ایجادِ شر، شر نہیں۔ پاخانہ فی حدِّ ذاتہ بیشک قبیح ہے مگر مجموعۂ قصر کے لئے خیر ہے بلکہ قصر شاہی بدون اس کے ناقص اور غیر مکمل ہے۔

سیاہ بال اور سیاہ خال اگرچہ فی حد ذاتہ بدنما اور بُرے ہیں مگر آفتاب اور ماہتاب جیسے چہرہ کی رونق اور دل آویزی کو جس حد تک پہنچا دیتے ہیں اس سے غالبًا کوئی بے خبر نہیں۔ معدہ اور امعاء اگرچہ سرتاپا نجاست ہیں مگر اس میں شک نہیں کہ انسان جیسی مخلوق کے لئے مدارِ حیات ہیں۔

بہر حال یہ چیزیں گو انفرادی طور پر بری ہیں مگر مجموعہ کے لحاظ سے خیر محض ہیں۔ مجموعہ بدون ان چیزوں کے بے زیب رہتا ہے۔ لہذا جس طرح ایک انسان میں بدون خال اور سیاہ بالوں کے حسن نہیں پیدا ہوتا۔ اسی طرح مجموعۂ عالم میں بدون کفر اور ضلالت کی سیاہی کے حسن نہیں پیدا ہو سکتا۔ مجموعۂ عالم میں حسن جب ہی آسکتا ہے جب اسمیں حسین چہرہ کی طرح ایمان و ہدایت بھی ہو اور سیاہ بالوں اور نجاست معدہ کی طرح کفر و ضلالت بھی ہو۔

ایمان و ہدایت اپنی ذات سے حَسَن ہیں اور کفر و ضلالت اپنی ذات سے قبیح مگر ایجاد اور خلق دونوں کا حَسَن اور خیر ہے۔ کیونکہ مجموعہ عالم میں جیسے خیر کی ضرورت ہے ویسے ہی شر کی بھی ضرورت ہے ورنہ مقصد ناقص اور ناتمام رہتا ہے اسلئے کہ ایجاد عالم سے مقصود حق تعالیٰ کو کوئی اپنا ذاتی نفع اور نقصان نہیں ——

بنانے سے اس کے کمالات میں کوئی اضافہ نہیں اور نہ بنانے سے کوئی کمی نہیں مقصد صرف اس قدر ہے کہ اپنے کمالات اور صفات کے مظاہر پیدا فرمائے اور اپنی خوبیوں کو ظاہر کرے۔

اور ظاہر ہے کہ اس کے کمالات کسی ایک دائرہ میں محدود نہیں بلکہ مختلف قسم کے ہیں۔ اگر وہ رحم و کرم کا مالک ہے تو عقاب والم کا بھی مالک ہے، معز اور مذل بھی ہے، منعم اور منتقم بھی ہے۔ پس اگر بعض صفات کمالیہ کے مظاہر پیدا کئے جائیں اور بعض کے نہ پیدا کئے جائیں تو مقصد ناتمام رہتا ہے، اس لئے ضروری ہوا کہ انعام اور انتقام، اعزاز اور اکرام دونوں ہی کے مظاہر پیدا کئے جائیں۔ یعنی مومن بھی ہوں اور کافر بھی۔ دار انعام بھی ہو اور انتقام بھی۔ ابوبکرؓ اور عمرؓ بھی ہوں۔ ابوجہل اور ابولہب بھی ہوں۔ ؎

درکارخانۂ عشق از کفر ناگزیر ست	دوزخ کرا بسوزد گر بولہب نباشد

پس منکرین کو اس واسطے پیدا کیا تاکہ ان کو عذاب دے اور صفتِ قہر و غضب کا اظہار ہو۔ اور مومنین کو اس لئے پیدا کیا تاکہ ان کو مورد الطاف بنائے اور صفت ترحم کا اظہار ہو۔ اور گناہگاروں کو اس لئے پیدا فرمایا تاکہ صفتِ عفو اور مغفرت کا اظہار ہو۔ کما قال اللہ تعالیٰ۔

لِيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ	تاکہ حق تعالیٰ منافقین اور منافقات
وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ	اور مشرکین اور مشرکات کو عذاب
وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ	دیں اور مومنین پر توجہ فرمائیں
عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ	اور بے شک حق تعالے

وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۔ غفور رحیم ہیں۔

پس الحمد للہ تعالیٰ یہ ثابت ہو گیا کہ ایجاد شر کسی طرح شر نہیں کیونکہ ایجاد اور خلق کے معنی اعطاء وجود یعنی کسی شئے کو وجود عطا کرنے کے ہیں۔ خالق کی طرف سے صرف وجود آتا ہے جو کہ نور اور سراسر خیر ہے اور شر جو کچھ ہوتا ہے وہ اس مخلوق کی ذات میں ہوتا ہے اور مخلوق کا خالق سے مبائن اور منفصل ہونا ایک کھلی ہوئی بات ہے اور خلق اور ایجاد خالق کی صفت ہے۔

پس جب کہ مخلوق خالق سے بالکل مبائن اور منفصل ہے۔ اب اگر مخلوق فی ذاتہ قبیح ہو تو اس سے خالق یا اس کی ایجاد کی طرف کوئی قبح منسوب نہیں ہو سکتا۔ کسی کوزہ کا بدنما ہونا کوزہ گر کے بدنما ہونے کو مستلزم نہیں۔ کسی حرف کا بدنما ہونا کاتب کے بدنما ہونے کی دلیل نہیں۔ اس لئے کہ کوزہ، کوزہ گر سے اور حرف کاتب سے ایک منفصل اور جدا چیز ہے۔

رضا بالقضا

اس بیان سے یہ اشکال بھی حل ہو گیا کہ جب تمام معصیتیں اس کی قضا و قدر سے وقوع ہوتی ہیں اور اہل اسلام کے نزدیک رضا بالقضا بھی لازم ہے تو تمام معاصی پر بھی راضی ہونا لازم ہونا اور ضروری ہوگا۔ اس لئے کہ ہم ابھی بتلا چکے ہیں کہ خالق کی ایجاد اور اس کی مخلوق میں فرق ہے۔ کیونکہ ایجاد خالق کی صفت ہر اور اس کے ساتھ قائم ہے۔ اور مخلوق خالق سے ایک منفصل اور جدا شئے ہے اسی طرح قضاء قدر اور شئے ہے اور مقضی یعنی جس پر قضاء و قدر واقع ہوئی

وہ اور شے ہے۔ تقدیر اور ہے اور مقدر تقدیر سے ایک علیحدہ چیز ہے۔ کیونکہ تقدیر اور قضاء حق تعالیٰ کا ایک فعل ہے اور مقضی اور مقدر اسی کا مفعول ہے۔ پس معاصی خود قضاء و قدر نہیں بلکہ محلِ تقدیر اور محلِ قضاء ہیں لہٰذا تقدیر اور قضاء جو کہ فعل خداوندی ہے اس پر راضی ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس محلِ تقدیر پر بھی رضا ضروری ہو مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ سنکھیا کا ایجاد کرنا ایک بہت بڑا کمال ہے تو اس ایجاد کے پسندیدہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ سنکھیا بھی کوئی ایسی محبوب اور پسندیدہ شے ہو جائے کہ اس کا استعمال جائز ہو جائے۔ ٹھیک اسی طرح ایجادِ شر اور تخلیق معصیت کا پسندیدہ ہونا اس کو مستلزم نہیں کہ اس شر اور معصیت کا ارتکاب بھی پسندیدہ ہو۔ اور اسی وجہ سے ارشاد ہے:۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَرْضیٰ لِعِبَادِہِ الْکُفْرَ۔

صدور اور خلق کا باہمی فرق

بہر حال ایجادِ شر، شر نہیں۔ ہاں صدورِ شر بیشک شر ہے۔ کیونکہ صدور مصدر سے کسی وصف کے ظاہر ہونے کا نام ہے۔ اور یہ وصف اولاً اور بالذات مصدر میں ہوتا ہے اور دوسری چیزیں اسی کے پرتو سے اس وصف کیساتھ موصوف ہوتی ہیں۔

پس اس لئے تمام کمالات اور ساری خوبیاں اسی کی ذات میں موجود ہیں، اور اسی کے فیض اور پرتو سے یہ کمالات مخلوقات میں ظاہر ہوتے ہیں، اس نظریہ سے اس کو مصدرِ کمالات اور مصدرِ خیر کہا جائے گا۔ مگر مصدرِ شر

نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے کہ اس کی ذات شر اور برائی سے بالکل پاک ہے۔

جیسے آفتاب کو مصدر نور اور منبع ضیا کہہ سکتے ہیں مگر مصدر ظلمت نہیں کہہ سکتے اس لئے اس میں نور ہی نور ہے ظلمت کا نام و نشان بھی نہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کی شعاعیں ہر پاک و ناپاک پر واقع ہوتی ہیں۔

اسی طرح حق تعالیٰ کی ایجاد خیر و شر، ایمان و کفر۔ ہدایت و ضلالت سب ہی پر واقع ہوتی ہے مگر اس کی ذات میں سوائے خیر محض کے اور کچھ نہیں۔ اور اسی وجہ سے جب صدور خیر و شر کا ذکر آتا ہے تو صدور خیر کو حق تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور صدور شر کو بندہ کی جانب۔

قَالَ تَعَالٰی مَا اَصَابَکَ مِنْ حَسَنَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ وَمَا اَصَابَکَ مِنْ سَیِّئَۃٍ فَمِنْ نَّفْسِکَ لہ۔ — تجھ کو جو کچھ بھلائی پہونچتی ہے وہ اللہ کی جانب سے ہے اور برائی خود تیرے نفس سے پہونچتی ہے۔

اس آیت میں خیر کو حق تعالیٰ کی طرف کیا اور کلمہ مِنْ کو استعمال کیا یعنی خیر اور حسنہ اللہ سے آتی ہے اور شر اور سیئہ خود انسان سے آتی ہے۔ اور حدیث میں ہے:۔

الخیر کلہ فی یدیك والشر لیس الیك۔ — ساری بھلائیاں آپ کے قبضہ میں ہیں اور کوئی برائی آپ کی طرف منسوب نہیں کی جاتی۔

اور جس جگہ ایجاد خیر و شر کا ذکر آیا تو دونوں ہی کی ایجاد کو اپنی جانب منسوب فرمایا اس لئے کہ ایجاد خواہ خیر کی ہو یا شر کی بہرحال کمال ہے کما قال اللہ تعالیٰ۔

قُلْ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ۔ — سب چیزیں اللہ کی پیدا کی ہوئی ہیں۔

اور اس مقام پر بجائے کلمہ مِنْ کے لفظ عند کا استعمال فرمایا۔ اور اسی وجہ سے حضرات فقہاء فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ کو خالق القردۃ والخنازیر کہنا جائز نہیں کیونکہ ان چیزوں کو خلق کے لئے مخصوص کرنے میں اگر استہزاء نہیں تو سوء ادب ضرور ہے اس لئے خالق کل شیٔ کہنا چاہیئے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسی ادب کو ملحوظ رکھ کر اِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنَ میں مرض، کو جو کہ ایک ناگوار اور مکروہ شے تھی اس کو اپنی جانب منسوب فرمایا اور شفاء جو کہ ایک مرغوب اور محبوب شے تھی اس کو خدا کی جانب منسوب کیا اور یہ نہیں فرمایا کہ وَاِذَا اَمْرَضَنِیْ فَهُوَ يَشْفِيْنَ (اور وہ جب مجھ کو مریض کرتا ہے تو پھر وہی شفا دیتا ہے) بلکہ یہ فرمایا کہ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنَ (جب میں بیمار ہو جاتا ہوں تو وہ شفا دیتا ہے۔

اسی طرح حضرت ایوب علیہ الصلوٰۃ والسلام نے شدت مرض کی حالت میں یہ فرمایا

رَبِّ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ۔	اے پروردگار مجھکو تکلیف پہونچی اور بیشک آپ ہی ارحم الراحمین ہیں

اور یہ نہیں فرمایا کہ

اَمْسَسْتَنِیَ الضُّرَّ فَارْحَمْنِیْ۔	آپ نے مجھ کو تکلیف پہنچائی پس رحم فرمائیے۔

اسی طرح حضرت خضر نے

فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِیْبَهَا۔	میں نے اس کو عیب دار بنانے کا ارادہ کیا۔

اس قول میں عیب کو اپنی جانب منسوب فرمایا اور

فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَا اَشُدَّهُمَا	پس خدا نے چاہا کہ وہ دونوں اپنی جوانی کا زمانہ

وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ — پائیں اور اپنا دفینہ خدا کی رحمت سے نکال لیں

اس قول میں چونکہ خیر کا ذکر تھا اس لئے اس کو رب العالمین کی طرف منسوب کردیا اور رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ اور مَا فَعَلْتُهُ عَنْ اَمْرِیْ کا اور اضافہ کردیا اور

فَاَرَدْنَا اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ — ہم نے چاہا کہ خدا ان کو بہتر بدل عطا فرما دے

میں صیغہ جمع کا استعمال فرمایا اس لئے کہ یہ صورت من وجہ خیر تھی اور حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نظر میں شر تھی۔ یا یہ کہا جائے کہ اس میں کچھ حصہ خیر کا تھا اور کچھ حصہ شر کا۔ کیونکہ شر کو بدل کر خیر پیدا کی گئی اس لئے صیغہ جمع کا استعمال کیا تاکہ یہ مجموعہ مجموعہ پر منقسم ہو جائے۔ خیر حق تعالیٰ کی جانب منسوب ہو جائے اور شر حضرت خضر کی جانب۔ اور تبدیل چونکہ خیر محض تھی اس لئے اس کو فقط خدا کی طرف منسوب کیا گیا۔

ایک شبہہ اور اس کا ازالہ

شبہہ یہ ہے کہ جب ایمان اور کفر اور ہدایت اور ضلالت سب کا وہی خالق ہے تو پھر ارسالِ رسل اور تنزیل کتب سے کیا فائدہ؟ جس کو ہدایت دینا تھی اس کو ہدایت دیدی ہوتی اور جس کو کافر اور گمراہ بنانا تھا اس کو کافر اور گمراہ بنا دیا ہوتا۔ اس طویل و عریض سلسلہ کے قائم کرنے کی کیا حاجت تھی؟۔

لیکن جب ہم سلسلۂ تکوینیات پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ شبہہ بالکل بیجان اور بے روح معلوم ہوتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ موت و حیات، وجود و عدم

سب کا خالق وہی ہے۔ اور سب اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اسی کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ جب وہی حیات وممات کا خالق ہے تو پھر ہر ایک کے لئے کیوں اسباب اور مسببات کا طویل سلسلہ قائم کر دیا۔ پہلے نطفہ ہوا اور پھر علقہ اور پھر مضغہ اور پھر جنین ہوا اور علیٰ ہذا مختلف طور گذرنے کے بعد وہ ایک کامل انسان بنتا ہے حالانکہ وہ قادر مطلق اگر چاہتا تو ایک ہی آن میں انسان کامل پیدا ہو سکتا تھا۔ علیٰ ہذا انسان کی حیات کے لئے جو اسباب پیدا فرمائے ان میں بھی تدریجی رفتار ہے۔ اول تخم کو خاک میں دفن کیا جاتا ہے۔ پھر اس کی آبیاری کی جاتی ہے اور علیٰ ہذا پھر ایک عرصہ کے بعد اس میں کچھ بالیں نمودار ہوتی ہیں۔ اور طرح طرح کی صعوبتوں کے بعد اسمیں سے غلہ حاصل ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ قادر مطلق اگر چاہتا تو سب کچھ ایک ہی آن میں ہو سکتا تھا اور علیٰ ہذا موت کیلئے بھی اسباب کا ایک طویل سلسلہ پھیلا دیا۔ طرح طرح کے امراض پیدا فرمائے۔ سنکھیا اور سمی دوائیں بھی پیدا کیں تو کیا کوئی شخص یہ سوال کر سکتا ہے کہ جب خدا کو مارنا ہی تو دفعتہً موت کیوں نہیں آجاتی۔ ان امراض اور آلام کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟ اور جب خدا کو زندہ کرنا ہے تو اسباب حیات کو اس قدر طول دینے کی کیا حاجت ہے۔ دفعتہً ایک انسان کیوں نہیں پیدا کر دیا جاتا۔ اتنے اطوار و ادوار میں کیوں وقت خرچ کیا جاتا ہے۔

غالباً آپ اس کا یہی جواب دیں گے کہ بیشک اس کی قدرت نہایت کامل اور وسیع ہے مگر اس کی سنت عالم اسباب میں اسی طرح جاری ہے کہ ہر شئے سلسلۂ اسباب و مسببات میں مقید رہے۔ پس اسی طرح روحانی حیات یعنی ایمان وہدایت اور روحانی ممات یعنی کفر و ضلالت کے لئے بھی ایک سلسلۂ اسباب قائم فرمایا۔

اس کے علم ازلی میں یہ یقیناً تھا کہ فلاں شخص سم الفار کھا کر ہلاک ہو گا۔ فلاں شخص فلاں فلاں امراض میں مبتلا ہو کر جان دیگا۔ مگر باوجود اسکے پھر اطبار کو پیدا فرمایا اور سمیات اور تمام ادویہ کے خواص ان کو بتلائے تاکہ وہ سب کو بتلا دیں کہ فلاں شئے مفید ہے اور فلاں شئے مضر۔ اور فلاں نافع ہے اور فلاں مہلک۔ اسی طرح اسکو یہ بھی معلوم تھا کہ فلاں شخص کفر کر کے ابدالآباد کیلئے ہلاک ہو گا۔ مگر اس نے اپنی حکمت بالغہ سے روحانی اطبار یعنی انبیاء و رسل کو مبعوث فرمایا تاکہ خلق اللہ کو یہ بتلا دیں کہ کفر روحانی حیات کے قطع کرنے میں سم الفار سے کم نہیں۔

خلاصہ یہ کہ جس طرح تکوینیات میں اسباب اور مسببات کے سلسلہ کا ہونا خلاف عقل نہیں اسی طرح تشریعیات میں بھی اسباب اور مسببات کے سلسلہ کا ہونا خلاف عقل نہیں۔

اس قدیر و حکیم نے اپنی حکمت بالغہ سے سم الفار اور سانپ کو پیدا کیا۔ پھر سانپ میں زہر و نیش زنی کا داعیہ بھی پیدا کیا۔ پس جس شخص کو زہر چڑھتا ہے وہ خدا کے ہی فعل سے چڑھتا ہے اور اسی کی قدرت سے وہ مرتا ہے۔ لیکن اس جگہ اس کی قدرت سم الفار اور سانپ کے واسطہ سے کارفرما ہے۔ ایسی حالت میں اگر انسان ہلاک ہو جائے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اسکے سم الفار کھانے کا انتقام ہے بلکہ یہ کہا جائے گا کہ زہر کھانے پر یہ اثر مرتب ہوا۔ اور یہ ہلاکت اس قسم کی ہلاکت نہ سمجھی جائے گی جیسے پھانسی اور قتل سے ہوتی ہے۔

رہا یہ سوال کہ سانپ کو کیوں پیدا کیا اور کس لئے اسمیں زہر رکھا۔ سم الفار کو کیوں پیدا کیا اور اسمیں یہ تاثیر کیوں رکھی؟ سو اس سوال کے جواب میں ایک موحد اور ملحد یکساں طور پر ساکت ہو جائیں گے۔ موحد اس علیم و حکیم کے علم ازلی اور حکمت بالغہ کے سامنے سر جھکا دے گا اور ملحد مادہ اور صورت نوعیہ کے اقتضاء کے سامنے جھک پڑے گا۔

خلاصہ یہ کہ یہ جزار بطور انتقام نہیں بلکہ بطور تسبیب و اثمار ہے۔ گلاب کا قلم لگانے سے

گلاب پیدا ہوتا ہے اور بید کے تخم سے بید ہوتا ہے ؎

گندم از گندم بروید جو ز جو　　　از مکافاتِ عمل غافل مشو

بہر حال سم الفار کھانے سے موت آتی ہے اور امرت کے استعمال سے حیات۔ رہا یہ سوال کہ کیوں آتی ہے؟ اسکے جواب سے صرف ہم ہی قاصر نہیں بلکہ عالم میں کسی فرد کے پاس بھی اس کا جواب نہیں سوائے اس کے کہ زہر اور امرت کی تاثیر ہی یہ ہے۔

اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ ایمان کی خاصیت حیات اور بقائے ابدی ہے اور کفر کی ذاتی تاثیر ہلاکت ابدی ہے۔ سنکھیہ اگر مادی زہر ہے تو کفر معنوی زہر ہے۔ امرت اگر ظاہری حیات بخشتا ہے تو ایمان معنوی حیات عطا کرتا ہے۔

اور جس طرح اجسام کو بقا نہیں ہے اسی طرح انکی راحت و آرام بھی دائمی نہیں اور روح چونکہ ایک ابدی شے ہے اس لئے اسکی لذت و آرام بھی جاودانی ہے۔ پس جس طرح سم الفار سے موت کا آنا انتقام نہیں بلکہ اس مادی زہر کا اثر اور ثمر ہے۔ اسی طرح کفر سے جہنم میں جانا بھی انتقام نہیں بلکہ کفر جو کہ ایک معنوی زہر ہے اسکا اثر ہے۔ بلکہ سم الفار اور زہر درحقیقت سراپا موت ہے اسی طرح کفر خود آگ ہے۔ سم الفار کا اثر بدون تریاق کے زائل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح کفر جو کہ ایک معنوی زہر ہے اسکا اثر زائل کرنے کے لئے بھی ایک تریاق کی ضرورت ہے اور وہ تریاق توبہ اور تجدید ایمان ہے۔ غرض یہ کہ کفر ایک معنوی زہر اور سراپا نار ہے۔ قیامت کے دن ہر شخص اپنے اعمال کو اصلی صورت اور ذاتی تاثیر کے ساتھ نمایاں طور پر مشاہدہ کریگا۔ کما قال تعالےٰ۔

وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا وَّلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا۔　　　اور جو کچھ کیا ہے وہاں اس کو حاضر پائینگے اور خدا کسی پر کسی قسم کا ظلم نہیں کرتا۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ جب کفر اسی کی مشیت سے ہوتا ہے اور اسی کی مشیت سے کافر جہنم میں

جلتا ہے تو کیا حق تعالیٰ نے ایک شخص کو محض تکلیف پہنچانے کیلئے پیدا کیا۔ اور پھر اس کے لئے کفر بھی مقدر کیا تاکہ وہ صفت قہر و غضب کا مظہر بنے۔ یہ اچھا اظہار صفت ہے کہ جس سے دوسرے تکلیف میں مبتلا ہو گئے۔

لیکن یہ سوال مادیات اور تکوینیات میں بھی جاری ہو سکتا ہے۔ ایک شخص کیلئے یہ مقدر کیا کہ وہ سم الفار کھا کر ہلاک ہوگا۔ تو پھر کیا اس صورت میں اسکو تکلیف نہیں پہنچی تو کیا ضرورت تھی کہ سمّ الفار پیدا کیا جائے۔ اور پھر یہ بھی مقدر کیا جائے کہ فلاں شخص زہر کھائیگا اور تڑپ کر جان دیگا۔

بہر حال تکلیف و ایذاء دونوں ہی جگہ ہے۔ یہاں بھی اور وہاں بھی۔ فرق اتنا ہے کہ ایک جگہ اس نے مضرات اور سمیات مادیہ کا استعمال کیا اور ایک جگہ سمیات معنویہ و روحانیہ کا مضرات مادیہ سے بچانیکے لئے اطباء اور حکماء کو پیدا کیا اور ان کو طب جسمانی کے قواعد الہام فرمائے اور خدا سے الہام پا کر عائشہ خلائق کو جسم کے عوارض ذاتیہ اور اس کے منافع اور مضار بتلائے۔

اور مضرات معنویہ اور سمیات روحانیہ سے بچانیکے لئے روحانی اطباء یعنی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث فرمایا اور طب روحانی یعنی شریعت انکو عطا فرمائی۔ ان حضرات نے مبعوث ہونیکے بعد روح کے عوارض ذاتیہ اور اس کے منافع اور مضار سمجھائے۔

بدن چونکہ عارضی ہے اور دیرپا نہیں اسلئے اسکے اسباب اور مبادی پر نتائج مرتب ہوتے ہیں زائد دیر نہیں ہوتی اور ہر آنکھ اس کا مشاہدہ کر لیتی ہے جیسے زہر اور سانپ سے ہلاک ہونا ہر شخص اپنی آنکھ سے دیکھ لیتا ہے۔ اور روح چونکہ ایک طویل الحیات شے ہے اسلئے اگر اسکے بعض نتائج اور ثمرات قرنہا قرن میں بھی جا کر ظاہر ہوں تو کوئی حرج نہیں اسلئے کہ اسکی طویل عمر کے لحاظ سے یہ طویل قرن بھی ایک قصیر مدت ہے۔ قال تعالیٰ۔

اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا وَّنَرٰهُ قَرِيْبًا ۔ وہ اس دن کو بعید خیال کرتے ہیں اور ہم اس کو قریب ہی دیکھ رہے ہیں۔

آدمی کی حالت اس شخص کے مشابہ ہے کہ جس نے کسی مخدر چیز کا استعمال کیا ہو۔ وہ اسوقت آگ کی سوزش محسوس نہیں کرتا اور جب اس مخدر کا اثر کم ہو جاتا ہے تب اس کو تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ اسی طرح کفر بعینہ نار ہے مگر دنیا کی منشیات اور یہاں کی مخدرات اس معنوی نار کے محسوس ہونے سے مانع ہیں۔ عالم آخرت میں پہنچکر دنیا کی تمام لذائذ کا نشہ کافور ہو جائیگا اور اس معنوی زہر کی تکلیف محسوس ہونے لگیگی۔ الحاصل روحانی سلسلہ کا زہر کفر ہے۔ اور ایمان امرت اور آب حیات ہے۔ اور اعمال صالحہ بمنزلہ مقوی غذاؤں کے ہیں اور اعمال سیئہ بمنزلہ مضرات قابل پرہیز ہیں۔

خلق اور کسب کا فرق

یہ بیشک صحیح ہے کہ ہر عمل پر اس کی خاصیت اور تاثیر کے مطابق ثمرہ مرتب ہوتا ہے مگر اس ترتیب میں انسان کا کسب اور اس کی سعی ضرور شرط ہے۔

تقول مع العصیان ربی غافر	صدقت ولکن غافر بالمشیئۃ
باوجود معصیت کے خدا کو غفار بتلاتے ہو	صحیح ہے لیکن اگر خدا چاہے
وربك رازق کما ھو غافر	فلم لم تصدق فیھما بالسویۃ
جس طرح خدا غفار ہے اسی طرح رزاق بھی ہے	دونوں کو یکساں مفید ہے
فانك ترجوا العفو من غیر توبۃ	ولست ترجی الرزق الا بحیلۃ
مغفرت کی تو بدون توبہ کے امید رکھتے ہو۔ لیکن رزق ملنے کی امید بغیر کسی حیلہ اور ظاہری تدبیر کے نہیں کرتے	
علی انہ بالرزق کفل نفسہ	لکل ولم یکفل لکل بجنۃ
حالانکہ خدا نے رزق کا تو ذمہ لیا ہے	مگر جنت کا ذمہ نہیں لیا۔

ہلاک ہونے کے لئے سم الفار کا اپنے اختیار سے استعمال کرنا شرط ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ ہلاکت اسی کی مشیت سے ہے مگر اسکی یہ مشیت سم الفار کے واسطہ سے کارفرما ہے جیسے نجار کے بعض افعال بلا واسطہ صادر ہوتے ہیں اور بعض افعال آلات کی وساطت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ضارب اور قاتل سے بعض مرتبہ ضرب بلا واسطہ صادر ہوتی ہے اور بعض مرتبہ تیر اور تلوار کے واسطہ سے اس کا ظہور ہوتا ہے۔ اسی طرح افعال الٰہیہ کا ظہور کبھی بلا واسطہ ہوتا ہے اور کبھی بندہ کے ہاتھ سے اس کا ظہور ہوتا ہے۔ کما قال تعالیٰ شانہٗ

قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ	ان سے قتال کرو حق تعالیٰ تمہارے
بِاَيْدِيْكُمْ الاٰيہ۔	ہاتھ سے ان کو عذاب دیں گے۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ بندہ کے ہاتھ سے ظاہر ہوتا ہے وہ حقیقت میں اسی کا فعل ہوتا ہے ہمارے جوارح اسکے افعال کیلئے مظہر اور واسطہ ہو جاتے ہیں۔ حقیقت میں وہی عذاب دینے والا ہے مگر ہمارے ہاتھ سے۔ حقیقت میں وہی دیکھنے والا اور سننے والا ہے۔ وہی حرکت کرنے والا اور چلنے والا ہے مگر ہمارے ہاتھوں سے۔ ہماری سمع و بصر سے۔ ہمارے قدم اور پیروں سے یعنی ہمارے ہاتھ اور پیر اور ہماری سمع و بصر اس کے افعال کے لئے مظاہر اور وسائط ہیں۔ اور اسی وجہ سے کہ یہ جوارح افعال الٰہیہ کے مظاہر ہیں۔ حدیث میں ان جوارح کو مجازاً خدا کی طرف منسوب کر دیا۔

کما ورد فی مسلم مرفوعًا لا یزال	جیسا کہ صحیح مسلم میں مرفوعًا روایت ہے کہ بندہ
عبدی یتقرب الیّ بالنوافل حتی	ہمیشہ نوافل سے تقرب حاصل کرتا رہتا ہے
احبہ فاذا احببتہ کنت سمعہ الذی	یہاں تک کہ میں اس کو محبوب بنا لیتا ہوں
یسمع بہ وبصرہ الذی یبصر بہا و	پس وہ میرے ہی کان سے سنتا ہے اور

یدہ الّتی یبطش بہا ورجلہ الّتی یمشی بہا ۔ — میری آنکھ سے دیکھتا ہے اور میرے ہی ہاتھ سے پکڑتا ہے اور میرے ہی پیر سے چلتا ہی

وقال تعالیٰ اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ۔ — جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہوتا ہے۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے نبی کریمؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کرنا اپنے ہی دستِ قدرت پر بیعت کرنا قرار دیا ہے۔ کیونکہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا دستِ مبارک اسی کے دستِ قدرت کا مظہر ہے۔

وقال تعالیٰ مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۔ وقال تعالیٰ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّیْهِمْ — یعنی رسول اکرمؐ کی اطاعت خداوندی اطاعت کی تو مظہر ہے ـــــ ان کے مال سے صدقہ لیجئے تاکہ وہ صدقہ ان کو پاک کردے

اس آیت میں اخذ صدقات کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب فرمایا اور دوسری آیت میں اپنی جانب منسوب فرمایا۔

کما قال تعالیٰ ۔ اَلَمْ یَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَیَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ — کیا انھیں علم نہیں کہ اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے ۔ اور اسے زکوٰۃ لیتا ہی

ان دونوں آیتوں میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت میں آخذ صدقات وہی ہو مگر چونکہ ظہور اس کا نبی کریمؐ کے دستِ مبارک پر ہوا اسلئے ایک مرتبہ نبی کریمؐ کی طرف منسوب کردیا۔

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ — اے مسلمانو تم نے ان کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے قتل کیا ۔ اور اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جس وقت

وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی ۔ الآیہ۔ آپ نے خاک کی مٹھی پھینکی وہ حقیقت میں آپ نے
نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی۔ + + + + + +

یعنی حقیقت میں قاتل اور فاعل ہم ہی ہیں اور تم محض آلہ اور واسطہ ہو۔ جس طرح تیر اور تلوار تمہارے افعال کے لئے آلہ اور واسطہ ہیں اسی طرح تم ہمارے افعال کیلئے مثل تیر کمان کے واسطہ اور مظہر ہو۔ وقال ابو الطیب ؎

فانت حسام الملک واللّٰہ ضارب وانت لواء الدین واللّٰہ عاقد۔

آنیوالے چونکہ دروازے سے گذرتے ہیں اسلئے دروازہ انکے لئے ایک مخرج اور مظہر ہے۔ مگر مُولِد یعنی پیدا کرنیوالا نہیں ہے۔ اسی طرح سے اعضاء انسانی حرکاتِ الٰہیہ اور افعالِ خداوندی کے لئے دروازے ہیں کہ جن سے افعال الٰہیہ کا خروج اور ظہور ہوتا ہے۔ اگر کوئی دروازہ ہی کو مولد سمجھ بیٹھے تو یہ اس کی نادانی ہو گی۔

معتزلہ نے جب جوارح انسانیہ پر افعال الٰہیہ کا ظہور دیکھا تو انسان اور اسکے اعضاء ہی کو ان افعال کا خالق بتلا دیا۔ اور جبریہ نے اس مخرج اور مظہر سے قطع نظر کرکے تمام افعال کو اصل کی جانب منسوب کر دیا۔ اور اشاعرہ نے ظاہر و باطن دونوں ہی کو ملحوظ رکھا۔ باطن پر نظر کرکے خدا کو خالق بتلایا اور ظاہر پر نظر کرکے بندہ کو کاسب بتلایا۔

توفیق اور استدراج

انسان جب بہیمی جذبات کو کسب کرتا ہے تو ویسی ہی اسکو مدد دی جاتی ہے اور جو امور اس کے مناسب ہوسکتے ہیں وہی اس کے لئے آسان کر دیئے جاتے ہیں اور ملکی جذبات کو کسب کرنا چاہتا ہے تو پھر ویسی ہی اسکو امداد دی جاتی ہے اور اسی کے مناسب امور اسکے لئے

سہل کر دیئے جاتے ہیں - قال تعالیٰ -

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا - الآیہ

ہر ایک کی امداد کرتے ہیں - ان کی بھی اور انکی بھی - خدا کی عطا کسی سے رد کی نہیں گئی -

وقال تعالیٰ - اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۔ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى -

بے شک تمہاری کوشش مختلف ہے - پس جسنے دیا اور ڈرا اور کلمۂ توحید کی تصدیق کی اسکے لئے اعمال صالحہ کو سہل کر دینگے اور جسنے بخل کیا اور تکذیب کی اس کے لئے برے اعمال میں سہولت پیدا کر دینگے -

ایک شخص اپنے کسب سے ہدایت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسکو ہدایت میں مدد دی جاتی ہے اور اسباب ہدایت اس کیلئے پیدا کر دیئے جاتے ہیں، اور جو کفر اور ضلالت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کو اس میں امداد دی جاتی ہے - ہدایت میں امداد دینے کا نام **توفیق** ہے اور کفر و ضلالت میں امداد دینے کا نام **استدراج** اور امہال ہے -

آفتاب بالذات روشن ہے اور نور قمر اور نور کواکب آفتاب سے مستفاد ہے - بہرحال نور آفتاب بھی نور آفتاب ہے، اور قمر بھی حقیقت میں نور آفتاب ہی ہے مگر دن کو آفتاب بلا واسطہ روشنی ڈالتا ہے اور شب کو قمر اور کواکب کے واسطہ سے - لیکن جب آفتاب بلا واسطہ روشنی ڈالتا ہے تو اسکی تاثیر بھی اور ہوتی ہے اور احکام بھی اور جب وہی آفتاب شب کو قمر کے واسطہ سے روشنی ڈالتا ہے تو تاثیر اور احکام سب بدل جاتے ہیں حتی کہ نام بھی بدل جاتا ہے - چنانچہ دن کی روشنی کو دھوپ اور شب کی روشنی کو چاندنی کہتے ہیں - ٹھیک اسی طرح ارادۂ الٰہیہ بمنزلہ شمس کے ہے کبھی بندہ کے ارادہ میں سے ہو کر گذرتا ہے تو اسکو کسب کہتے ہیں

اور کبھی بلا واسطہ عمل پیدا ہوتا ہے تو اس کو خلق کہتے ہیں۔

اور یہی وجہ ہے کہ ابوجہل اور ابولہب کو اٰمنوا کا خطاب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی وساطت سے ہوا۔ اور امرالٰہی کا ظہور نبی کریمؐ کی زبان پاک سے ہوا۔ سو اس واسطہ اور حجاب کے حائل ہو جانے کی وجہ سے ابوجہل اور ابولہب ایمان وہدایت سے انکار کر سکے۔ ورنہ اگر بلا واسطہ ان کو کُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ کا خطاب ہوجاتا تو وہ یقیناً صدیق بنجاتے۔ کما قال تعالیٰ۔

اِنَّمَا اَمْرُہٗ اِذَا اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنَ۔ خدا کی شان یہ ہے کہ جب کسی شے کا ارادہ فرماتے ہیں تو کن فرمادیتے ہیں وہ شے فوراً ہو جاتی ہے

اور اسی وجہ سے عہد الست میں خطاب بلا واسطہ تھا۔ یک لخت سب نے بلیٰ کہدیا اور اس عالم میں خطاب حجاب اور واسطے سے ہوا اسلئے کوئی اس عہد پر قائم رہا اور کوئی نہ رہا۔

بہرحال کفر کی ذاتی تاثیر نار جہنم ہے جیسے سانپ کی ذاتی تاثیر ہلاکت ہے۔ مگر جس طرح ہلاکت کے لئے سانپ کا کاٹنا شرط ہے اسی طرح نار جہنم کے لئے بندہ کا کفر کرنا شرط ہے۔ دیا سلائی میں مادہ آتش گیر موجود ہے مگر آگ کے لئے اس کا رگڑنا شرط ہے۔

لیکن اب ہم ترقی کر کے کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ بندہ کے دل میں کفر کا فقط داعیہ ہی رکھدیتے اور بندہ کے کسب اور ارادہ کو دخل نہ ہوتا بلکہ اضطراراً اس سے کفر صادر ہوتا تب بھی اس کا جہنم میں جانا کوئی ظلم نہ ہوگا کیونکہ تاثیر اسباب میں ارادہ شرط نہیں انسان اگر اپنے کسب واختیار سے سنکھیا کھائے تب بھی مرتا ہے اور اگر سہواً کھائے تب بھی ہلاک ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

تمام شد